ہمارے تعلیمی اداروں میں کتاب اور کتب خانے

مولانا ساجد احمد صدوی
جامعہ فاروقیہ، کراچی

بڑی، کشادہ اور شاندار عمارتوں میں قائم ایسے اداروں کی وطنِ عزیز میں اب کوئی کمی نہیں، جہاں دینی علوم، ساخت و دریافت والے فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نونہالانِ قوم کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا جاتا ہے، اقوام عالم کے دوش بدوش بلکہ ان سے بھی آگے نکل جانے کیلئے تربیت دی جاتی ہے، علم و آگہی کے فروغ میں کوشاں یہ ادارے سرکار ہی کی مرہون منت نہیں؛ بلکہ ان کی بنیادوں میں عوام کا گاڑھا پسینہ اور بے لوث جذبۂ خدمت بھی بھرا ہوا ہے۔

اسے اہل وطن کی فرض شناسی کہئے یا علم دوستی کہ سرکار کی طرف سے ان اداروں کے قیام، انتظام میں امداد و تعاون کی توقع تو دور کی بات حوصلہ افزائی تک نہیں؛ پھر بھی اعلیٰ انسانی اقدار کو فروغ دینے والے مرکز، بہترین اسلامی روایات کی بنیاد پر معاشرہ کو تشکیل دینے والے ان اداروں سے ہماری قوم نے رشتہ ناطہ نہیں توڑا۔

ملکی غیر ملکی میڈیا نے بارہا پروپیگنڈے کا بازار گرم کیا، ان اداروں کی کردار کشی کی ہزار کوششیں کیں، سرکار نے بھی بدمست ہاتھی کی طرح اپنا زور دکھایا، نہایت حوصلہ شکن رویہ رکھا؛ مگر آفرین ہو اس قوم کو جس کی غالب اکثریت خطِ غربت سے بھی نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، کہ نامساعد حالات کے باوجود علم وفن کے فروغ، دین کی سربلندی کا جذبہ اس کے رگ وریشے میں پیوست ہے اور برابر اس جذبے کو عام کرنے، پروان چڑھانے میں پیش پیش ہے۔ عوام ہی کے دامے، درمے تعاون کی برکت سے یہ روشنی تعلیمی اداروں کے بواسطہ میڈیا کے بازیگروں کی حمایت حاصل کئے بغیر ساری دنیا میں پھیل رہی ہے۔

کتاب کی ضرورت :

دینی علوم ہوں، چاہے ساخت و دریافت کے فنون، سبھی کے حصول، تخصص اور ان میں ترقی کرنے کے لیے ''کتاب'' کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ لکھی پڑھی دنیا میں تسلیم شدہ وہ نظریہ، تھیوری ہے، جس سے سے باشعور انسان کو کبھی اختلاف نہیں رہا۔ بڑی تعداد میں اپنے موضوع پر بہترین کتابوں کو مہیا کیے بغیر کوئی بھی درسگاہ

معیاری تعلیم اور صحیح تربیت کی ذمہ داری پوری نہیں کرسکتی۔ اور نہ ہی کوئی علمی وتحقیقی ادارہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ علم وفن میں نمایاں کارکردگی دکھانے والی تمام شخصیات کی کامیابیاں فضل خداوندی کے بعد کتابوں ہی کی مرہون منت رہی ہیں۔

''کتاب'' بہترین رہبر منزل ہے، جو اس بات کا پتہ بتاتی ہے کہ راہروانِ علم وفن کہاں تک چلے، کون سی گھاٹی کو سر کرچکے ہیں اور وہ کون کون سے دشوار گزار راستے، گھاٹیاں اور اتھاہ سمندر ہیں جن کی تہہ تک پہنچنا، ان کو سر کرنا اور وہاں سے گزرنا ابھی رہتا ہے۔

''کتاب'' کے وجود، فراہمی کو علم وفن کے حوالے سے جتنا بھی ناگزیر کہا گیا اور اس کی جتنی بھی اہمیت بیان کی گئی۔ اتنی ہی ناقدری کا اس کو ہمارے ملک میں سامنا رہا۔ یہاں کی علمی فضاؤں میں اس کا سکّہ جما نہیں، یہ اپنا لوہا منوا نہ سکی؛ کیونکہ تعلیم کی بہتری کا اب رواج نہ رہا، تعلیمی اداروں میں بھی معاش کی بہتری پہلا اور آخری ہدف بنی ہوئی ہے، معیاری تعلیم صرف اُسی کا نام ہے جو فرد کے ''معاشی مسائل'' کو حل کرنے میں کام آئے۔

انصاف کی بات کہنے پر تو پابندی تھی ہی اب کسی مسئلے کی خاطر ''پابند خانہ'' ہوجانا؛ بلکہ ''پابند سلاسل'' کا مسئلہ اٹھانا بھی جرم قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ نام نہاد ''دہشت گردی'' کی طرح باختیار ججوں کی ہمارے ملک میں کوئی عدالت ''انسداد جہالت'' کی بھی ہوتی تو ''کتاب'' کے شیدائی اور اس کے متلاشی تعلیمی اداروں کے منتظمین، پرنسپلز اور بااثر شخصیات کے خلاف ''کتاب'' کے حق میں مقدمہ دائر کرتے، اس کو ''پابند خانہ تاریک'' کرنے کے خلاف آواز اٹھاتے اس کی آزادی، نقل وحمل میں آسانی اور فراہمی بسیار کے لیے کوئی تحریک چلاتے؛ مگر افسوس کہ نہ انصاف فراہم کرنے والے لوگ ہیں اور نہ ہی ''کتاب'' کے ایسے حامی جو کسی لائبریری کی خاطر جان تک کی بھی بازی لگائیں۔

کتاب سے لاتعلقی :

ملک کے طول وعرض میں قائم علم وفن کی علم بردار درسگاہوں، تحقیقی کام کرنے والے اداروں اور کتابوں کو بسانے والی لائبریریوں میں ایک بار صورتِ حال دیکھنے کو جائیں، وہاں کے علمی ماحول کا جائزہ لیں۔ لائبریری کو ایک نظر ہی دیکھ لیں تو ہر جگہ ''کتاب'' کو خاموش طبع ہونے کے باوجود یہ صدا لگاتے اور یہ فریاد کرتے پائیں گے کہ:

''علم وفن کی اونچی بڑی نسبتیں رکھنے والے بھی ضرورت، مفادات سے ورے میرا پاس لحاظ نہیں رکھتے، برسوں مجھے پوچھنے نہیں آتے میرے ناقابل فراموش احسانات کے باوجود مجھے وہ حیثیت نہیں دیتے ہیں جو واجب الأداء حق کے طور پر علمی دنیا نے میرے لیے تسلیم کی ہے!''

''کتاب'' کی آمد، فراہمی اور حفاظت، بندوبست کے امور ''غور وخوض'' اور ''ضروریات ومسائل'' کی لمبی

لمبی فہرستوں میں بھی کوئی جگہ نہیں پاتے، اس کے لیے نہ فنڈ مختص کیے جاتے ہیں اور نہ ہی کوئی ''لائحہ عمل'' طے کرنے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے؛ بلکہ بیشتر اداروں میں موجود محدود ذخیرہ بھی کسی سنجیدہ پروگرام کے بغیر ہی جمع ہوا ہوتا ہے۔

کتاب سے لاتعلقی، اجنبیت کبھی تو اس قدر بھی بڑھ جاتی ہے کہ وسیع وعریض، بلند وبالا عمارتوں کے بیچوں و بیچ، مہمان خانے، طعام خانے اور مسافر خانے کے پہلو بہ پہلو علم کی اس ابتداء وانتہاء کے لیے کوئی ''آزاد خانہ'' بھی نہیں رکھا جاتا، جہاں علم وفن میں ترقی کے خواہاں طلبہ کو کسی روک ٹوک کے بغیر آنے جانے کی سہولت میسّر ہو، کتابوں سے باخبر اور ''کتاب خواں'' کے ذوق مزاجِ لطیف کو سمجھنے والے لائبریرین وہاں موجود ہوں۔ بھلا علم کا دشوار گزار اور طویل سفر رفیقِ راہ منزل کے بغیر بھی کبھی طے کیا گیا ہے؟

آخری سانس :

کتنے ہی نادر ونایاب مخطوطات اور پرانی مطبوعہ کتابیں ہیں کہ ابھی تک ستانے کے لیے کوئی جگہ بھی ان کو نصیب نہیں۔ بعض جگہوں پر تو صرف نووارد شائقین کی خاطر آخری دیدار کے لیے ہی رکھی ہوئی نظر آتی ہیں جو ہاتھ لگانے کی بھی تکلیف برداشت نہیں کرسکتیں، سطح زمین پر رہتے ہوئے بھی آکسیجن سے محروم، گرد وغبار کی تہہ در تہہ جمی ہوئی بہت ساری ایسی کتابیں ہیں جو آخری سانس لے رہی ہیں: بلکہ بہتوں نے تو اس طرح خاموشی کے ساتھ انتظار کی گھڑیاں تمام کرلیں کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

ایسی ہی کتابوں کے دیدار کا خیال لیے ہوئے جب کوئی ''عاشق ناکام'' ادھر کو آنکلتا ہے، اور ناظم ومنتظم کی رقیبانہ نگاہوں سے سرک کر ان کے قریب پہنچتا ہے، تو غم کے مارے اس کا کلیجہ باہر آنے کو لگتا ہے، وہ چیخ وپکار، آہ وبکا کرتا ہے، اپنی ''محبوبہ'' کے ''بے رحمانہ قتل'' پر بین کرتا ہے؛ مگر اس کی آواز کسی اجنبی کتاب بیزار کو سنائی نہیں دیتی صرف ''عاشقانِ کتاب'' ہی کو اس کا رونا رلاتا ہے وہی اکیلے اس کا مرثیہ پڑھتے ہیں اور حسرت ویاس کے ساتھ دیر تک اس کو یاد کرتے ہیں۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمین کھاگئی آسمان کیسے کیسے

شاید اسی خوف رسوائی کی وجہ سے میوزیم، آرکائیوز اور لائبریریوں کے منتظمین ''عاشقانِ کتاب'' کو دیکھتے ہی تیور بدل دیتے ہیں، طرح طرح کے حیلے بہانے کرکر کے ان کو قریب پھٹکنے سے بھی روکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں کتنی ہی ایسی لائبریریاں، مخطوطات اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کے لیے بنائے گئے ادارے ہیں، جن پر نہ صرف یہ کہ قومی خزانے سے بڑی خطیر رقم خرچ کی گئی ہے بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرنے والے ''ماہرین بزعم خویش'' بھی فن وثقافت کی خدمت، حفاظت کے لیے داخل رجسٹر ہیں مگر اس

کے باوجود ''عاشقانِ کتاب'' کا وہاں جا کر خون ہی ہوتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ خاموش دیواروں کے اس طرف تاریکی میں الماریوں کے بیچوں بیچ کیسی کیسی نایاب کتابیں، تاریخی دستاویزات [جو اہلِ علم و دانش کے نزدیک قیمتی جانوں سے کم نہیں] ماہرین کی موجودگی میں ضائع ہو چکی ہیں، بلکہ ان کی باقیات بھی چوراچورا ہو کر دیمک کی خوراک بن چکی ہیں! ماضی ہی کی کوتاہیوں کو یاد کر کر کے غمزدہ ہونے کی مجھے عادت نہیں، میرے اور آپ کے جیتے جاگتے حال میں بھی تاریخ کا یہ سیاہ باب برابر رقم ہو رہا ہے۔

کتابوں کی سرگذشت :

یہی غم لیے ایک صاحب ''رضا علی عابدی'' نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں لندن سے آ کر پاک و ہند کا طویل سفر اختیار کیا تھا۔ موصوف بی بی سی اردو سروس کی طرف سے اس مہم جوئی کے لیے خاص طور سے بھیجے گئے تھے؛ چنانچہ دورانِ سفر پیش آمدہ تمام حالات، روئداد اور کارگذاری کو قلمبند بھی کرتے رہے، جس کو انہوں نے مختلف پروگراموں میں بی بی سی اردو سروس سے نشر کیا، بعد میں موصوف نے ان نشری پروگراموں کو ایک کتاب کی شکل دیدی اور یوں یہ سفرنامہ پہلی بار ۱۹۸۵ء میں ''کتب خانہ'' کے نام سے پبلیکیشنز کراچی سے شائع ہو کر اہلِ علم کے ہاتھوں تک پہنچا۔

اہلِ علم و ادب کی تسکینِ ذوق کا سامان لیے اردو میں قلمبند کئے گئے سفرناموں کے نام لیے جا سکتے ہیں مگر رضا علی کی یہ روئداد تسکینِ ذوق کے بجائے ''صاحبانِ کتاب'' کے لیے ''تحریکِ ذوق'' بلکہ ''تحریقِ ذوق'' کا سامانِ غم لئے ہوئی ہے۔ جس میں قدم قدم پر کتابوں کی تباہی بربادی کی داستان بیان ہے، تاتاریوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ یہ سب کچھ اپنے ہی لوگوں کا کیا کرایا ہے۔

موصوف ''ان سے ملئے'' کے خوبصورت اور سچے رومان بھرے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں۔

> ''یہ وہ کتابیں ہیں جو آج ہیں اور شاید کل نہ ہوں اور یہ ان بے شمار کتابوں کے مزار ہیں جو خاک کی صحبت میں رہتے رہتے خود بھی خاک ہو گئیں۔ ایسی خاک جس سے اب کوئی شگوفہ نہیں پھوٹے گا''۔

یہ اس قافلے کا ذکر ہے جس کے قدموں کے زیادہ تر نشان مٹ چکے ہیں؛ لیکن جو باقی ہیں وہ اتنے کم بھی نہیں کہ سمتوں اور منزلوں کا پتہ نہ چلے۔ (۱)

جب بات چلتی ہے پرانی مطبوعات، مخطوطات کی یا نایاب قلمی دستاویزات کی حفاظت کی ان کی ضرورت اور اہمیت کی تو طرح طرح سے خدشات، خطرات لوگوں کو لاحق ہونے لگتے ہیں، کچھ لوگ تو احساسِ زیاں میں کہے جا رہے ہوتے ہیں؛ مگر سبھی کو یہ درد نہیں اٹھتا، عموماً ارباب اختیار اور ''بزرگان مسند نشین'' اس طرح کے قصے، کہانیاں

سنانا شروع کر دیتے ہیں؛ تاکہ وہ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں پر پردہ ڈالیں، یا اس راہ کو صعوبتوں کا سامنا کرنے کے بجائے فرار اختیار کرنے کے لیے وجہ جواز بنا سکیں۔

ان لوگوں کی یہ عادت، روش کچھ کتابوں کے ساتھ ہی خاص نہیں، مفادات سے ورے تمام اجتماعی نوعیت کے کاموں میں ان کا یہی طرز عمل اور افسوسناک رویہ چلا آرہا ہے، بے ہمت اور کوتاہ بین لوگ ہمیشہ اس طرح کی ذمہ داریوں سے میل کھاتے ہیں۔

رضا علی لکھتے ہیں:

.....مگر اس احساس کی تہہ میں کتنے ہی درد اور کتنے ہی کرب چھپے ہوئے ہیں، یہ گزری صدی کی نہیں حالیہ برسوں کی بات ہے۔ جب اعلیٰ روایات اور تہذیب کے اسی گہوارے میں اور اسی سرزمین میں نہ معلوم کتنی دستاویزیں مٹی میں اور نجانے کتنے کتب خانے خاک میں ملے ہیں۔

یہاں ہم علم کے ان سفینوں کی باتیں کریں گے جو بے خبری کے ساحلوں سے چلے اور قدر شناسی کے محفوظ کناروں پر جا لگے اور علم کے ان قافلوں کا ذکر بھی ہوگا جو راہ میں دن دیہاڑے لٹ گئے"۔ (۲)

کتاب کا گذرا ہوا دور:

برصغیر پاک و ہند میں علم اور کتاب کا چرچا کس حد تک تھا، یہاں کے باشندوں کو "کتاب" سے کتنا تعلق تھا۔ پھر لوگ بدلے، تاریخ بدل گئی، اور بزرگوں کی برسہا برس کی محنت، تگ و دو پھر یوں ہی پانی پھیر دیا گیا، ان کی آرزوؤں کا خون کیا گیا، عابدی بیان کرتے ہیں:

"کہتے ہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب برصغیر کے ہر صاحب حیثیت کے دولت کدے میں تین خانے ہوا کرتے تھے۔ مہمان خانہ، اسلحہ خانہ اور کتب خانہ، ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف حیدر آباد دکن میں چار ہزار کتب خانے تھے۔

مگر ہوا کے رخ بدلے تو وقت کے جھونکے ان دولت خانوں کو سوکھے پتوں کی طرح اڑا لے گئے۔ بوسیدہ مکانوں کے اندر اور ٹوٹی پھوٹی چھتوں کے نیچے ایسے کئی بزرگوں سے میری ملاقات ہوئی جنہوں نے اپنی آنکھوں سے کتابوں کے یہ شاندار ذخیرے دیکھے تھے اور پھر ان ہی کی آنکھوں نے سونے چاندی کے پانی سے لکھی ہوئی کتابیں ٹھیکروں کے بھاؤ بکتے یا وقت کے ہاتھوں مٹتے دیکھیں۔

ان کتابوں کی باتیں کرکرتے ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور ہونٹ لرزنے لگے'' (۳)

باب الاسلام ''سندھ'' کے تاریخی ورثے، یہاں کے کتب خانوں کا ذکر کرتے ہوئے ''علم کی وادی'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ وہ زمانہ گیا جب گھر گھر کتب خانے ہوا کرتے تھے۔ اور امراء کو تو جانے دیجئے غریب غرباء تک جیسے بھی بن پڑتا تھا گھر کے ایک طاق میں کچھ نسخے ضرور سجالیا کرتے تھے۔

اور کیسی عجیب بات ہے کہ جب خوشنویس راتوں کو چراغ کی روشنی میں کتابیں نقل کر کرکے بیچا کرتے تھے ان دنوں کوئی گھر کتابوں سے خالی نہ تھا؛ مگر جب راتوں رات چھاپ کرارزاں کتابوں کے ڈھیر لگادینے والا چھاپہ خانہ آیا تو کتابوں کا ذوق جاتا رہا''۔ (۴)

کراچی میں کتابیں :

عابدی صاحب نے ''حیدرآباد دکن'' کا رونا رویا؛ مگر ''اپنا شہر کراچی'' کا کیا حال انہوں نے دیکھا۔ فروری ۱۹۸۲ء میں ''کتابوں سے بھرے گھر'' کے نام سے ان کا یہ تجزیہ بھی پڑھتے جائیں۔

''کراچی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کتابوں کی کتنی بڑی دولت پورے برصغیر سے سمٹ کر وہاں پہنچی ہے اور کسی کو خبر نہیں کہ کون سے خستہ حال مکان میں کیسے کیسے نادر نسخے آج تک اپنے محسنوں کے منتظر ہیں۔

لیکن شاید اب اس شہر کے نصیب میں کوئی دوسرا ممتاز حسن نہیں، جس طرح دلی کے حصے میں حکیم عبدالحمید آئے۔ یہ بٹوارہ کراچی کو کوئی ایسی شخصیت نہ دے سکا کہ کتابیں جس کا دم بھریں۔ کچھ ایسی ہی بات ایک روز مشفق خواجہ نے کہی۔

''پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے جو لوگ آئے وہ اپنے ساتھ مخطوطات بھی لے کر آئے اور یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ حکومت پاکستان نے ''نیشنل میوزیم'' کے لیے ان مخطوطات کی خریداری کی اور ممتاز حسن مرحوم خاص طور پر اس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ تو اس وقت نیشنل میوزیم میں تقریباً نو ہزار مخطوطات ہیں۔ اور جن میں بہت سے مخطوطات منحصر بہ فرد ہیں۔ یعنی ان کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔ اسی طرح مولوی عبدالحق جب آئے تو وہ ''انجمن ترقی اردو'' کی لائبریری کے مخطوطات کا ایک حصہ اپنے ساتھ لیتے آئے اور وہ بھی بہت نادر ذخیرہ ہے۔ خصوصاً دکنیات سے متعلق کتابیں اس میں بہت

ہیں۔ یہ چیزیں (بھی اب) نیشنل میوزیم میں ہیں''۔(۵)

عابدی نے جو تعداد مخطوطات کی مرحوم مشفق خواجہ مرحوم کے حوالے سے نقل کی یہ روایت پرانی ہے ''کتب خانہ گنج بخش اسلام آباد'' کی مرتب کردہ فہرست میں اس میوزیم کے اندر گیارہ ہزار مخطوطات موجود ہونے کا ذکر ہے۔ (۶) قدیم و نایاب مطبوعات دیگر دستاویزات کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ یہیں ہر بڑے سائز میں قرآن مجید کا ایک فوٹو بھی موجود ہے۔ جو طاشقند میں محفوظ ایک نہایت قدیم نسخے سے لیا گیا ہے۔ یہ نسخہ صدر پاکستان مرحوم ایوب خان کو تحفے میں دیا گیا تھا طاشقند کے اس نسخے کی بابت مشہور ہے کہ وہ خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نسخۂ خاص تھا۔ چنانچہ شہادت کے وقت آپ کا خون مبارک بھی اس مصحف کو لگا۔ جس کے اثرات دکھائی دیتے ہیں مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے اپنے خطبات میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔(۷)

کراچی میں کتابیں کہاں کہاں ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بہترین کاوش محترم محمد یوسف نعیم صاحب نے کی ہے، موصوف نے اپنے جیب خرچ پر شہر میں موجود لائبریریوں میں جا جا کر وہاں کے حالات دیکھے، مواد، سہولیات اور ان لائبریریوں تک پہنچنے کے راستے، ذرائع نقل و حمل کے بارے میں تفصیلات جمع کیں۔ پھر ان سب ضروری معلومات کو ایک کتابچے کی شکل دے کر ''کراچی کے عوامی کتب خانے ایک تعارف'' کے نام سے شائع کرایا۔ جن دنوں موصوف یہ کام کر رہے تھے۔ راقم بھی اسی نوعیت کے ایک کام میں مصروف تھا۔ مگر ابھی ہمارا کام تشنۂ تکمیل تھا کہ برادر محترم کی یہ کتاب مارکیٹ میں نمودار ہوئی۔

موصوف کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے سٹیزن لائبریری لائز ایسوسی ایٹس (CLLA) کے صدر جناب آفتاب فاروقی نے ان کو اپنی تنظیم کی اعزازی رکنیت پیش کی، جسے انہوں نے قبول کیا۔ محمد یوسف نعیم صاحب کو اس کاوش پر بہت کچھ اعزازت بخشے جا سکتے تھے۔ اگر وہ ملکی نہ ہوتے، یا کم از کم اتنا اچھا رفاہی کام یہیں پر رہتے ہوئے نہ کیے ہوئے ہوتے؛ بلکہ ہم وطن، ثقافت اور ہم مذہب لوگوں سے دور رہ کر دیارِ غیر میں جا کر کرتے!

مذکور الصدر رسالے میں مسلک ''اہل حدیث'' سے نسبت رکھنے والے کتب خانوں کو تعبیر کی خاص اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جن لائبریریوں کے منتظمین کا تعلق مسلک اہل حدیث سے ہے، موصوف ان کو خاص اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ شہر میں کئی ایسے بڑے اہم کتب خانے بھی موجود ہیں۔ جو اپنی تعدادِ کتب، موضوعات کے تنوع اور سہولیات و ماحول کے اعتبار سے ان کے پسندیدہ کتب خانوں سے بڑھ کر ہیں۔ مگر یا تو ان کا ذکر نہیں کیا گیا یا اتنی سادہ اور بے توصیف عبارت میں کہ پڑھنے والے کے دل میں اس سے کوئی فوری تحریک نہ اٹھے۔

انڈیا آفس لائبریری

لندن میں ''انڈیا آفس لائبریری'' کے نام سے ایک عظیم لائبریری ہے۔ جہاں پر برصغیر پاک و ہند سے

جایا گیا نہایت نایاب اور قیمتی علمی ذخیرہ محفوظ تھا کتابوں کا یہ ذخیرہ ایک عرصے تک دیگر امور کی طرح تعطل اور تنازع کا شکار رہا۔ رضا علی نے ملک کے نامور ادیب اور دانشور قدرت اللہ شہاب مرحوم کی زبانی اس لائبریری کے بارے میں دو حریف ملکوں کے خیالات، احساسات کا جس انداز سے ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اگر اس لائبریری میں ہندوستان کا حصہ نہ ہوتا اور وہاں کی سرکار اپنے اسکالرز کی خاطر اس کی ضرورت محسوس نہ کرتی تو شاید اس کا ذکر تک نہ آتا۔ شہاب صاحب بیان کرتے ہیں:

''انڈیا آفس لائبریری'' میری بڑی محبوب لائبریری ہے۔ وہاں سے میں نے بڑا استفادہ کیا ہے۔ جب ملک تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ اس لائبریری کا بٹوارہ کر کے اسے دونوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تو اس پر باقی معاملات کی طرح بحث شروع ہوگئی۔''

۱۹۶۱ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے پنڈت جواہر لعل نہرو سے جو اس وقت کے وزیر اعظم تھے، ملاقات کی درخواست کی جو مانی گئی، اس کے بعد دلی کے پالم ائیر پورٹ پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ میں ان کا ہمرکاب تھا۔ اور اس میٹنگ کا ریکارڈ لکھنے کے لیے ان کے ساتھ موجود تھا۔ اس موقع پر فیلڈ مارشل ایوب خان نے کشمیر سمیت ہندوستان اور پاکستان کے مسائل بیان کئے اور ان مسائل پر اپنا رویہ تفصیل سے بیان کیا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو غور سے سنتے رہے اور سننے کے بعد ایک آدھ منٹ خاموش رہے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ شاید ان مسئلوں پر اب کوئی دوٹوک جواب دینگے؛ لیکن انہوں نے سر اٹھا کر کہا:

''فیلڈ مارشل! انڈیا آفس لائبریری کا کیا ہوگا؟''

اس موضوع پر ایوب خان صاحب کو پاکستان سے چلنے سے پہلے کسی نے بریف نہیں کیا تھا۔ تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا:

''تم اس کا جواب دو'' تو میں نے کہا: سر! آپ دونوں سے میری درخواست ہے کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے، یہ جہاں ہے وہیں رہے اور دونوں ممالک اپنے اپنے اسکالرز کو اور طالب علموں کو وظیفے دیں کہ وہ وہاں جا کر اس سے استفادہ کریں۔'' (۸)

یہ تو ہوئی بات بڑے صاحب کی، ہمارے ملک کے سیاسی مہرے کیا جانیں ''کتاب'' کیا چیز ہے؟ جس شخص کو بھی کرسی، عہدہ اور کوئی بڑا رتبہ اس کی ذاتی علمی حیثیت، فنی مہارت اور پیشہ ورانہ صلاحیت کی بنیاد پر نہ ملا ہو وہ

''کتاب'' کی اہمیت، اس کی قیمت کا صحیح اندازہ قائم نہیں کرسکتا۔ اور وزارتیں تو رہیں ایک طرف آج تک ہمارے ملک میں کوئی وزیر تعلیم بھی اپنی تعلیمی قابلیت کے بل بوتے پر وزیر نہیں بنا!

جو لوگ اپنی قوم، ملک کو کسی روشن اور یقینی مستقبل کی طرف لے جانا چاہتے ہوں، وہی جانتے ہیں کتاب کو، اس کی اہمیت اور ضرورت کو۔ اس کے برعکس جو لوگ ملک وقوم کے مستقبل سے بے خبر ہو کر صرف اقتدار کی ہوس میں لگے رہتے ہوں۔ اپنی انانیت اور رٹ کی خاطر اندھے بن کر چلتے ہوں، انسانی، اخلاقی اور آئینی حدود کو پامال کرنے سے بھی نہ کتراتے ہو۔ ان کو کیا فکر کہ چلڈرن لائبریری میں کتابوں کے ڈھیر پڑے ہیں کہ معصوم جانوں کے، وہ کیا جانیں ''انڈیا آفس لائبریری'' میں مخطوطے رکھے ہوئے ہیں کہ طوطے!

محترم محمد یوسف نعیم صاحب نے ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' لاہور کے حوالے سے ''مخطوطے طوطے ہو گئے'' کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے :

> ''پروفیسر محمد سلیم نے اپنے ایک کالم ''ان پڑھ وزیر تعلیم'' کے تحت لکھا ہے کہ ایک سابق وفاقی وزیر تعلیم کے بارے میں مشہور ہے کہ انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے لیے جب بھارت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے فرمایا کہ:
>
> ''باہمی کتابوں کی تقسیم ہو سکتی ہے؛ لیکن مخطوطوں کو کیسے تقسیم کیا جائے گا؟
>
> اس پر ہمارے وزیر تعلیم نے جواب دیا کہ
>
> ''مولانا آپ بے شک سارے طوطے لے جائیں، پاکستان میں طوطوں کی کمی نہیں''
>
> افسوس تو یہ ہے کہ وزیر تعلیم اتنے عمر رسیدہ ہو چکے تھے کہ انہیں پڑھانا بوڑھے طوطے کو پڑھانے کے مترادف تھا، اگر یہ کچھ عرصہ ''زیر تعلیم'' رہے ہوتے تو ایک اچھے وزیر تعلیم ثابت ہو سکتے تھے''۔ (۹)

یہ تھا قصہ ان کتابوں کا، مخطوطات کا جن کی نہرو کو تلاش تھی ''آزاد'' ان کے لیے فکرمند تھے۔ جب خواہی نخواہی پاکستان پہنچیں تو ان کو بڑے اہتمام کے ساتھ رکھا گیا۔ اتنے اہتمام کے ساتھ کہ پاکستان میں ہونے کے باوجود کوئی ''ان مقدس'' کتابوں کو چھو نہ سکے شہاب صاحب نے تو بڑی سادگی سے مشورہ دیا تھا کہ دونوں ملکوں کے اسکالرز، طالب علم سرکاری خرچ پر لندن جائیں اور اس گرانقدر ذخیرے سے استفادہ کریں۔

نیشنل میوزیم آف پاکستان

افسوس کہ آج تک ہم نے ایسا آدمی نہیں دیکھا جس نے ''انڈیا آفس لائبریری'' سے درآمد کردہ اس ذخیرے کی زیارت ہی کی ہو، یا زیادہ نہ سہی فہرست ہی ایک نظر دیکھی ہو! توہمات نہیں؛ بلکہ نامور محقق ڈاکٹر

ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اس بات کا انکشاف اپنی ایک ملاقات میں کیا۔ ان کے بقول سالہائے گذشتہ میں کاندہلہ میں قائم ''مفتی الٰہی بخش اکیڈمی'' سے منسوب ممتاز محقق جناب راشد الحسن کاندھلوی کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، موصوف کو انجمن ترقی اردو بورڈ کے ذخیرۂ مخطوطات میں سے ایک کتاب کی ضرورت تھی۔ جس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے نیشنل میوزیم کے عملے کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر دیا، وہاں جا کر کیا دیکھا کہ ''انجمن ترقی اردو بورڈ'' کی ملکیت تمام مخطوطات ابھی گٹھڑیوں میں اسی طرح بند رکھے ہوئے ہیں، جس طرح انجمن کی طرف سے حوالہ کئے گئے تھے۔ اس وجہ سے وہ کتاب کاندھلوی صاحب کو فراہم نہیں کی گئی۔

یہ ہے ہمارا طرز عمل اور قدر دانی ان مخطوطات اور قلمی دستاویزات کی جو نجانے کتنی تگ و دو اور برسہا برس کی محنت و مشقت کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے حاصل کی تھیں۔ ۱۹۴۸ء میں خاص ہماری فلاح و بہبود کی خاطر اور ہماری ہی خیر خواہی و سود مندی کی غرض سے اس قیمتی ذخیرے کو دہلی سے پاکستان منتقل کیا۔ تقسیم ہند کے ہوش ربا مناظر جن لوگوں نے دیکھے ہیں وہی اندازہ لگا سکتے ہیں اس محنت و مشقت کا اور ان کی قربانی کا۔

۱۹۶۷ء میں مرحوم ممتاز حسن اور ان کے دوستوں کی تحریک پر سید سرفراز علی رضوی نے انجمن کے ذخیرۂ مخطوطات میں سے فارسی اور عربی میں تحریر شدہ کتابوں کی جو فہرست بنائی تھی اس میں مختصر تعارف، کوائف کے ساتھ ایک ہزار پینتالیس مخطوطات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اردو ذخیرۂ مخطوطات، مطبوعات اور دیگر تاریخی نوادرات، ثقافتی دستاویزات اس کے علاوہ ہیں۔ (۱۰)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب کو حریف ملک سے آئے ہوئے اپنے معزز مہمان کے سامنے جو سبکی اٹھانی پڑی وہ ظاہر ہے؛ مگر میوزیم جا کر ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ ''انڈیا آفس لائبریری'' کا گرانقدر ذخیرہ بھی پیک رکھا ہوا ہے۔ ان کو بھی ابھی تک نہیں کھولا گیا!

رضا علی عابدی نے میوزیم کے اندر محفوظ چند نادر نسخوں کا ذکر کرنے کے بعد وہاں پر کام کرنے والے عملے کی خدمات اور علم پروری کا اس طرح ذکر کیا ہے :

> ''یہ تو خیر وہ کتابیں ہیں جو شوکیس مین سجی ہیں؛ لیکن اصل ذخیرہ اندر کہیں ہے، میں اسے دیکھنے کا خواہشمند تھا؛ چنانچہ میں نیشنل میوزیم پہنچا اور یہ نوہزار مخطوطے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جواب ملا کہ لائبریرین صاحب دستیاب نہیں، اسلئے داخلہ بھی ممکن نہیں!
>
> ان کتابوں کی حالت جاننے والے بعض علم دوستوں نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ یہی جواب ملے گا۔ (۱۱)

عابدی صاحب کو تو خیر سے ایک دو بار ہی میوزیم جانا پڑ گیا ہوگا۔ اس دوران لائبریرین صاحب کا موقع پر

موجود نہ ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں گردانی جاتی، چاہے وہ لائبریرین قومی ادارے کا ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تو وہ آدمی بھی اپنے کو بڑا نصیب ور خیال کرنے لگا ہے جس نے بیس مرتبہ جانے کے بعد بھی اس صاحب کو موقع پر موجود نہیں پایا؛ مگر کتابیں کسی طرح سے ایک نظر دیکھ ہی لیں۔

دس پندرہ سال سے خدمات سرانجام دینا تو ایسا سمجھا جاتا ہے جیسے کل ہی میوزیم میں آئے تھے۔ یہاں پر تو لوگوں کی زندگیاں تنخواہیں لیتے لیتے تمام ہو چکی ہیں؛ مگر اس دوران کتنی فہرستیں، اشارے، جائزہ رپورٹ، نادر و نایاب نسخوں کی نمائش، فہرست سازی اور لیبارٹری کی خدمات، دیگر ضروری تفصیلات پر مشتمل تعارف نامے، رسالے، تحقیقی مضامین اہلِ تحقیق بالخصوص لائبریری سائنس والوں کی ضرورت و ذوق کی خاطر شائع کئے گئے؟ کتابوں کے نئے ذخیروں کی آمد، مخطوطات کی خریداری، محققین کے ساتھ تعاون، ان کی حوصلہ افزائی کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ کیا تفصیلات ہیں؟ ایک متحرک ذمہ دار قومی ادارہ ہونے کے ناطے دوسرے اداروں کے ساتھ تبادلۂ علمی اور تعاون کے کیا کیا طور وطریقے ہیں؟ ان سب باتوں کو تو جانا در کنار مجھے تو وہاں کے ایک صاحب نے یہاں تک تنبیہ کی: کہ ایک صاحب کسی عدالت کے بڑے جج صاحب کی سفارش لے کر اسلام آباد سے یہاں خصوصی طور سے کتابیں دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ مگر ہمارے صاحب نے ان پر واضح کیا'' کہ یہ قومی ادارہ ضرور ہے مگر سپریم کورٹ کے تحت نہیں''۔ بعد میں ان کے ساتھ جزوی تعاون بھی کیا گیا مگر سفارش کی وجہ سے نہیں۔ ہم چاہتے تو یونہی اسلام آباد واپس ہو جاتے۔

یہ صدارتی ریفرنس سے کافی پہلے کی بات ہے۔ ابھی اگر اس شخص کو مذکورہ بالا بات یاد دلائی جائے تو پاؤں تلے زمین نکل جائے۔ یہ کہانی صرف ایک لائبریری، میوزیم کی نہیں، ملک میں قائم کتنی ہی لائبریریاں، میوزیم اور ثقافتی ادارے ہیں جہاں قیمتی، ثقافتی و تاریخی ورثہ رکھا گیا تھا، مگر وہاں پر موجود ذمہ دار افراد کی غفلت، کوتاہی اور نااہلی کی وجہ سے وہ ضائع ہو رہا ہے۔ بہت ساری چیزیں تو زیرِ زمین چلی گئی ہیں۔

اسلام آباد کی برباد لائبریری:

جب سرکار کی نگرانی میں ثقافتی ورثے کا حال یہ ہو تو عوامی سطح پر، گاؤں دیہات میں، کسمپرس لائبریریوں اور کتب خانوں کے اندر، افراد اور اداروں کے پاس اس کی حالت کیا ہوگی۔ یہ بیان کرنے کی نہیں۔ کتنے ہی شخصی کتب خانے الماریاں اور افراد ہیں جہاں نادر و نایاب مخطوطات، پرانی مطبوعہ کتابیں اور تاریخی دستاویزیں موجود ہیں؛ مگر وہ اس عظیم قومی امانت سے کسی کو استفادہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے، ان کی حفاظت کا سامان کرتے ہیں۔ اور نہ دوسروں کو قیمتاً دینے پر راضی ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ نوادرات مٹی کے ڈھیر کا سا روپ لے رہے ہیں۔

کیا قومی دھارے میں شامل ان لائبریریوں اور کتابوں پر ناجائز قبضہ جمانے والوں کے خلاف بھی

کوئی ''آپریشن سائلنس'' کیا جائے گا۔ یہ نوادرات چھڑانے کے لیے بھی کوئی کمانڈو ایکشن لیا جائے گا۔ ایک ''چلڈرن لائبریری'' کا ڈرامہ رچا کر حکومت نے طاقت کے نشے سے چور ہو کر وطن کے سینے میں چرا گھونپا، عوام کے دل باہر نکل آئے؛ حالانکہ کتابیں محفوظ تھیں، عمارت کا نقصان نہیں کیا گیا تھا۔ قوم ہی کی بیٹیاں وہاں موجود تھیں۔ قبضہ نہیں چاہتی تھیں صرف احتجاج کر رہی تھیں کیا آج کے جمہوری نظام میں اس سے بھی زیادہ کچھ کر گذرنے کی گنجائش نہیں!

سرحدوں کے محافظ جوانوں کو اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف کھڑا کیا گیا، انسان دشمن طاقتوں کی ایک تھپکی کی خاطر نظریہ کی آواز اٹھانے والوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ دشمنوں کے ساتھ تو امن مذاکرات کیے اور اپنوں پر بندوقیں تان لیں! سات دن تک دارالخلافہ کی فضاؤں میں دھوئیں کے بادل چھائے رہے، کیا کشمیر فتح کرنے نکلے تھے۔ جو قوم اپنے اساسی نظریے سے بھی اتنی دور چلی جائے کہ اس کے نام تک سے وحشت ہونے لگے، نظریے کی آواز کو اپنی کمزوری، پستی اور اقوام عالم کے سامنے اپنی بے عزتی تصور کرنے لگے، تو اس قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں تاریخ نے کبھی دیر نہیں کی۔ ایسی قوم ماضی کا حصہ تو ہو سکتی ہے حال کی قیادت کبھی نہیں کر سکتی۔

فن و ثقافت آج ڈھولک، ساز، گانے بجانے اور فلموں کا نام رہ گیا ہے، تفریح اور ثقافت کے نام پر فحاشی و عریانی کا بازار گرم ہے، رنڈیوں کو نچانا، طوائفوں اور بدکرداروں کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کرنا قومی دھارے کا حصہ بن چکا ہے، شو، کردار اور فن کے نام پر قوم کی بیٹیوں کی متاع گرانمایہ ''عفت و عصمت'' کا سودا کیا جاتا ہے، گھر کی ملکہ کو نونہالانِ قوم کی تربیت چھوڑ کر ''شمع انجمن'' بننے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس کی ویڈیو بنا کر سرِ بازار رسوا کیا جاتا ہے۔

قوم کے جوانوں کو تعمیری سوچ دینے، آگے بڑھنے کے صحیح انداز سکھانے کے بجائے بے ہودہ کھیل تماشوں، میراتھن ریس جیسی خرافات میں لگایا جاتا ہے، جنسی اور وحشی کرداروں پر مشتمل فلم دکھائے جاتے ہیں۔ اخلاق باختگی کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ کہ سادہ لوح خواتین کو شکار کرنے کے لیے تحفظ اور حقوق ہی کے نام سے نت نئے قوانین، طریقے رواج دیے جا رہے ہیں۔ بدبختی کی انتہا کہ فحاشی اور عریانی کے اڈوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی خاطر، اسلامی جمہوریہ میں مساجد اور مدارس کو بلڈوز کیا جاتا ہے۔ ان پر بم برسائے جاتے ہیں!

دو پڑوسیوں کی سوچ:

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان'' نے ۱۹۹۶ء میں پڑوسی ملک ایران اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ثقافتی پالیسی پر مشتمل ایک کتاب شائع کی تھی، جو اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں لکھی گئی تھی، درحقیقت

اس کتاب میں ایران اور پاکستان کی ثقافتی پالیسی کے خطوط کو یکجا شائع کرا کر موازنہ کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ ہمارے پالیسی سازوں نے اسلامی جمہوریہ کا ذکر تک نہیں کیا ہے، اور نہ ہی اسلامی نظریے سے باقاعدہ بحث کی ہے۔ جب پالیسی سازوں کا حال یہ ہو تو نیچے طبقہ سے کیا گلہ کیا شکوہ !؟

ذیل میں دونوں ملکوں کی ''ثقافتی پالیسی'' میں ''مقاصد'' کے تحت ذکر کیے گئے ابتدائی چھ اصول اور بنیادی باتوں کو پڑھیے، اور سر دھنیے:

''پاکستان کی ثقافتی پالیسی کے خدوخال''

الف، مقاصد :

ہمارے قیمتی ثقافتی ورثہ کے پیش نظر اور اس کی نشوونما کے لیے مناسب ماحول مہیا کرنے کی خاطر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایک ثقافتی پالیسی کا اعلان کیا جائے، جس کے مقاصد حسب ذیل ہوں:

۱۔ پاکستان کے ثقافتی ورثہ کا تحفظ کرنا، تمام شعبوں میں جیسے ادب، فن تعمیر، کھیل، موسیقی، رقص، عوامی آداب ورسوم، انسان کے بنائے ہوئے اوزار اور ہتھیار، فنونِ نمائش وادا کار، مصوری، دستکاری، فلمیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگرام اور ثقافت سے متعلق دوسرے شعبے۔

۲۔ معاشرہ کے مختلف طبقات کے لیے تمام ثقافتی سرگرمیوں کی تقویت اور حوصلہ افزائی کے لیے آزاد اور صحت مند ماحول مہیا کرنا۔

۳۔ ہمارے فن کاروں، دانشوروں، موسیقاروں، گلوکاروں، شاعروں، مصنفوں، دست کاروں، فن تعمیر کے ماہروں، اسٹیج اور فلم کے فن کاروں، رقص کے ماہروں اور ثقافتی سرگرمیوں سے متعلق دوسرے افراد کے افکار اور آرزوؤں کو قومی سالمیت کے عملی طریقہ کی جانب موڑنا۔

۴۔ مختلف سطحوں پر ثقافتی سرگرمیوں کی تعلیم وتربیت اور انجام دہی کے لیے مناسب مراکز مہیا کرنا۔

۵۔ تعلیم اور قانون سازی کے ذریعہ مذہبی جنون، عدم رواداری اور تشدد کی ثقافت کا قلع قمع کرنا۔

۶۔ تفریحی پروگراموں کو بہتر بنا کر، برقی ذرائع ابلاغ کے نئے چینل کھول کر مختلف مراکز میں پاکستان کی ثقافتی سرگرمیوں کی اشاعت کے عمل میں جدید ترین ٹیکنالوجی کو پہلی بار بروئے کار لا کر غیر ملکی ثقافت کے منفی پہلوؤں کی یلغار کی حوصلہ شکنی کرنا۔

پالیسیوں کے اس تسلسل کے آخر میں لکھا ہے:

۳۲۔ عدم رواداری، مذہبی جنون، تشدد اور مقامی تعصب کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے قومی اور صوبائی سطح پر قوانین وضع کیے جائیں گے۔

۳۳۔ آزادئ اظہار کو یقینی بنانے اور قومی تشخص اور سالمیت کی ترویج کے لیے ایسے قوانین جو استعماری ورثہ کی نمائندگی کرتے ہوں یا ثقافت کے فروغ کے منافی ہوں منسوخ کر دیئے جائیں گے۔ خاص طور پر وہ قانونی لازمہ جس کی ابتداء ۱۸۸۶ء میں کی گئی تھی اور جس کی رو سے ڈرامہ اور تھیٹر کے مسودہ کے بارے میں فیصلہ کرنا ضلعی حکام کے اختیار میں دے دیا گیا تھا، منسوخ کر دیا جائے گا۔

یہ ثقافتی پالیسی قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ و ثقافت کے صدر نشین کی صدارت میں ہونے والے اجلاس، مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۹۵ء میں منظور کی گئی۔ (۱۲)

روشن خیال بے نظیر اور حکومت میں بنائی گئی پالیسی کو پڑھ لینے کے بعد خمینی انقلاب کے بعد ایران کی ثقافتی پالیسی کو بھی ایک نظر دیکھ لیں۔

"اسلامی جمہوریہ ایران کی ثقافتی حکمت عملی"

مقاصد:

اسلامی جمہوریہ میں ثقافت کا مجموعی مفہوم اور ثقافتی حکمت عملی کے نام سے جو مجموعہ مرتب کیا گیا ہے، اس کی غرض و غایت حسب ذیل ہے:

الف: اسلامی جمہوریہ کے ثقافتی مقاصد:

۱۔ انسانی، اسلامی ثقافت کے عروج و ترقی اور معاشرے اور دنیا میں اسلامی انقلاب کے پیغام اور ثقافت کو پھیلانا۔

۲۔ ثقافتی استقلال، غیر ملکی تقاضوں کے بے ہودہ اور پست مظاہر کی نمائش کا قلع قمع اور زوال، نیز معاشرے کو غلط اور خرافاتی آداب و رسوم سے نجات دلانا۔

۳۔ زندگی کے ہر پہلو میں انسان کی تخلیقی اور شائستہ قوتوں کو کمال تک پہنچانا اور انسانی وجود میں پوشیدہ خزانوں اور خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔

۴۔ انسانیت کے اعلیٰ مرتبے تک رسائی کے لیے اخلاقی خوبیوں اور الٰہی صفات سے مزین ہونا۔

۵۔ مکمل ثقافتی انقلاب برپا کرنے کے لیے فرد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام اور اسلامی انقلاب کی مطلوبہ قدروں کا حصول اور ان کی حفاظت اور مطلوبہ معاشرے کے حصول

کی جدوجہد۔

۶۔ زمانے کے تقاضوں اور تبدیلیوں کو سمجھنا اور انسانی معاشروں کے ثقافتی ثمرات ونتائج کا جائزہ لینا اور اگر وہ اسلامی اقدار اور اصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں تو ان سے استفادہ کرنا۔ (۱۳)

ثقافت کے نام پر جن سرگرمیوں کی وجہ سے دینی اقدار پر زد پڑتی ہے۔ ان کا ذکر ایران کی پالیسی میں بھی ہے، جس کو اپنی اقدار کے ساتھ بے دینی کا فروغ ہی کہا جائیگا۔ مگر جہاں تک الفاظ وتعبیر کی بات ہے، مقاصد میں ان چیزوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی ثقافتی حکمت عملی میں ان کو مکرر سہ کرر دہرایا گیا ہے۔ جبکہ اپنے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ثقافتی پالیسی کا حال یہ ہے کہ شرعی رو سے منفی سرگرمیوں کو مقاصد کا حصہ بنایا گیا ہے۔

پھر اس کثرت سے ان کے تحفظ، فروغ اور حوصلہ افزائی کا ذکر کیا گیا ہے کہ گویا پالیسی اپنی سرگرمیوں کی خاطر بنائی گئی ہے اور ہماری ثقافت کی جھولی میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں!

بہاولپور میں کتابیں :

سندھی علماء کی اپنی لکھی ہوئی اور دنیا بھر سے ایک ایک کر کے ان کی جمع کردہ کتابوں کا ہم نے کیا حال کر دیا، اس کا ماتم گذر چکا، مگر خطۂ پنجاب میں ''کتاب'' کی سرگذشت کیا ہے، وہاں کیسے کیسے خزانے دن دیہاڑے لٹ گئے کہ آج تک ان کا سراغ بھی نہ لگ سکا، کسی کو نہیں معلوم کہ ''وہ کتابیں اپنے آباء کی.....'' کہاں چلی گئیں۔ یہ نوحہ بھی پڑھنے کا ہے۔

عابدی صاحب نے ''جہاں نگاہ نہیں جاتی'' جیسے تحریکی عنوان کے تحت نواب بہاول خان کی علم دوست ریاست کا یوں ذکر کیا ہے:

''کتابوں کی تلاش اب ہمیں ایک ایسے خطے میں لیے چلتی ہے، جہاں عام لوگوں کی نگاہ بھی نہیں جاتی۔ بہاولپور کے بارے میں سنا کرتے ہیں کہ ریاست کے زمانے میں اس کا نقشہ بالکل عراق جیسا تھا۔ وہاں عراق سے لا کر کھجور اگائی گئی تھی یہاں تک کہ ریاست کا دارالخلافہ بغداد الجدید کہلایا جانے لگا۔ اُس قدیم بغداد اور اس جدید بغداد میں یکسانیت صرف نقشے اور کھجوروں ہی کی نہیں تھی؛ بلکہ ایک دولت اور بھی تھی جس پر اُس بغداد کو بھی ناز تھا اور اِس بغداد کو بھی، اور وہ تھی علم کے جواہر پاروں کی دولت، ایسی ایسی کتابوں کی دولت جن کا دنیا میں صرف ایک نسخہ تھا اور وہ بھی اسی بہاولپور کی سرزمین پر۔'' (۱۴)

بہاولپور میں مولانا شمس الدین بہاولپوری صاحب کا مدرسہ تھا۔ جہاں پر دور دراز سے طلبہ حصولِ علم کے واسطے آتے تھے۔ مولانا جید عالم تھے۔ جس کا راز اُن کا علمی کتب خانہ تھا۔ مولانا کے پاس حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف وغیرہ دیگر علوم وفنون کی گرانقدر اور بڑی بڑی کتابیں موجود رہتی تھیں۔ ان کے پاس یہ عظیم الشان ذخیرہ کہاں

سے آیا تھا۔ تو درحقیقت یہ ذخیرہ کوٹ ادو پرہاڑ سے تعلق رکھنے والے پنجاب کے نامور محقق عالم اور بلند پایہ مصنف مولانا عبدالعزیز پرہاڑوی کا ذخیرہ تھا، جو کسی طرح مولانا کے پاس پہنچا۔

مولانا شمس الدین صاحب نے حضرت پرہاڑوی کے ذخیرۂ کتب سے خوب استفادہ کیا، ان کی تصنیفات پر کام بھی کیا۔ چنانچہ مولانا پرہاڑوی کی طب پر ضخیم کتاب اکسیر اعظم عربی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جو نول کشور، لکھنؤ سے پہلی اور آخری بار چھپا تھا۔

اس کتب خانے کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ جب برصغیر پاک و ہند کے نامور محدث اور فقیہ علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ ستمبر ۱۹۳۲ء میں دیوبند سے قادیانیوں کے بارے میں مشہور ''مقدمہ بہاولپور'' کے سلسلہ میں ریاست بہاولپور تشریف لائے تو مولانا شمس الدین صاحب کے کتب خانے سے خصوصی طور پر استفادہ کیا۔ اور مسئلہ قادیانیت پر نئے دلائل کا بروئے احادیث استخراج کیا؛ حالانکہ خود دارالعلوم کے کتب خانے میں مخطوطات اور مطبوعات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کا شمار ہندوستان کے چند ایک بڑے کتب خانوں میں ہوتا ہے؛ اگرچہ وہاں پر موجود ذخیرے کا حال بھی پاکستان میں موجود کتب خانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں!

مولانا شمس الدین بہاولپوری کے کتب خانے کو کیا ہوا، کتابیں کہاں چلی گئیں۔ شاید ہی کوئی اس کا جواب دے سکے! ؟۔

نواب صاحب کا کتب خانہ:

رضا علی نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے:

''بہاولپور یونیورسٹی کے اسلم ادیب نے ایک اور ذخیرے کی طرف توجہ دلائی۔

''نواب صاحب بہاولپور کے ذاتی کتب خانے کے بارے میں صحیح طور پر بتانا مشکل ہے؛ کیونکہ ہر ممکن کوشش کے باوجود میں اسے دیکھ نہ سکا، لیکن اس کے بارے میں یہ ضرور معلوم ہے کہ اردو کی ہر کتاب کا ایک نسخہ وہاں ضرور محفوظ کرلیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے بتایا گیا کہ وہاں خطوط کا ایک بڑا مجموعہ ہے جن میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے وہ خط بھی شامل ہیں جو انہوں نے نواب صاحب کو لکھے تھے۔ (۱۵)

اسلم ادیب صاحب نے تو صرف اردو ذخیرے کا ذکر کیا، مگر یہاں اردو سے زیادہ عربی اور فارسی کا بیش قیمت خزانہ محفوظ تھا۔ حضرت مولانا عبدالعزیز پرہاڑوی کی کتابیں بھی اس کتب خانے کی زینت تھیں۔ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے نواب صاحب کے نام جو خطوط لکھے تھے، اُن میں مولانا پرہاڑوی کی فلکیات پر کتاب ''سرالسماء'' سے

متعلق خطوط بھی شامل ہیں۔ اقبال کو اس کتاب کی بہت تلاش تھی، جس کے لیے انہوں نے کئی بار خط و کتابت کی تھی۔

نواب صاحب کے اس عظیم الشان ذخیرے سے ایک اسلم ادیب ہی محروم نہیں رہے: بلکہ ان کتابوں کی زیارت شاید ہی کسی خوش قسمت کو نصیب ہو، اسلم ادیب نے اسّی ۸۰ء کی دہائی کے شروع میں یہ بات کی تھی، جس کو اب پچیس برس ہونے کو ہیں۔ نجانے کب سے یہ کتابیں شوقِ دیدار لئے اپنے عاشقوں کے انتظار میں ہیں !

اپنا خیال تو یہ ہے کہ اس ذخیرے کا حال اس سے ذرا بھی مختلف نہ ہوگا جو ''نواب حیدر آباد دکن'' کے ذخیرے کا بن گیا تھا۔

چنانچہ عابدی لکھتے ہیں:

''سکندر علی وجد نے بھی ایک داستانِ الم کہہ سنائی ''نظام دکن'' کے ذخیرۂ کتب کی بات کر رہے تھے۔

''پولیس ایکشن کے بعد میں بڑے شوق سے ''کنگ کوٹھی'' گیا۔ وہاں میرے ایک دوست تھے۔ انہوں نے کہا: آپ کو کتابوں کا شوق ہے تو ''کنگ کوٹھی'' میں بھی ہیں دیکھ لیجئے۔ میں دیکھنے گیا تو حیران رہ گیا کہ ایسی بے مثال کتابیں، کھلے برآمدوں میں الماریوں میں رکھی ہیں۔

قریب سے دیکھا تو ہر کتاب مٹی کا تودہ بن چکی تھی۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک لیکن اگر انگلی لگائیے تو انگلی اندر دھنس جاتی ہے۔ تو میں نے تمام کتابوں کا یہ حشر دیکھا، وہاں ایک کتاب بھی سلامت نہیں تھی''۔ (۱۶)

حوالہ جات اور کتابیات

(۱) کتب خانہ، از رضا علی عابدی، صفحہ: ۳، ناشر: سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، سال اشاعت: ۲۰۰۳ء۔

(۲) ریضا، صفحہ: ۱۰۔ بعنوان: کتاب کس حال میں ہے؟ (۳) ایضا، صفحہ: ۱۵، بعنوان: روشنیوں کے جزیرے۔

(۴) ایضا، صفحہ: ۲۳، بعنوان: علم کی وادی۔ (۵) ایضا، صفحہ: ۱۰۴، ۱۰۵، بعنوان: کتابوں سے بھرے گھر۔

(۶) فہرست مخطوطات کتب خانہ گنج بخش، اسلام آباد، مرتبہ: محمد حسین تسبیحی، شائع کردہ: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد۔

(۷) خطبات بہاولپور، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، صفحہ: ۲۰، ۲۱، ناشر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، من طباعت: ۲۰۰۳ء، اشاعت نہم۔

(۸) کتب خانہ، رضا علی عابدی، صفحہ: ۱۶۱، ۱۶۲، بعنوان: جہاں رہے سلامت رہے۔

(۹) کراچی کے عوامی کتب خانے ایک تعارف، از محمد یوسف نعیم، ناشر: ندارد، سن طباعت: ذوالحجہ ۱۴۲۷ھ، مطابق جنوری ۲۰۰۷ء۔

(۱۰) مخطوطات، انجمن ترقی اردو (فارسی، عربی) مرتبہ: سید سرفراز علی رضوی، ناشر: انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی۔ سن اشاعت: ۱۹۶۷ء

(۱۱) کتب خانہ، رضا علی عابدی، صفحہ: ۱۰۵، بعنوان: کتابوں سے بھرے گھر۔

(۱۲) اصول سیاست فرہنگی، جمہوری اسلامی ایران و جمہوری اسلامی پاکستان، صفحہ: ۶۷، ۶۸ اور ۷۶، ناشر، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، سن اشاعت: ۱۹۹۶ء۔

(۱۳) ایضا، صفحہ: ۴۹۔ (۱۴) کتب خانہ، رجا علی عابدی، صفحہ: ۱۱۲، بعنوان: جہاں نگاہ نہیں جاتی۔

(۱۵) ایضا، صفحہ: ۱۲۵، بعنوان: وہ جو راہ میں رہ گئے۔ (۱۶) ایضا۔

.....(جاری ہے)